امن بذریعہ علم

Peace Through Knowledge

(2 جولائی 2011 - کے آئی آئی ٹی یونیورسٹی۔ بھبنیسوراڈیسہ بھارت میں دانشوروں، شاعروں اور ادیبوں سے خطاب)

چاند تارے جب اس آنگن سے گزرتے ہوں گے
شام وہ لوگ ہمیں یاد تو کرتے ہوں گے
ایک یہ شام کہ بھیگی ہوئی پلکیں ہیں وہی
ایک وہ شام جہاں چاند اترتے ہوں گے

میں یہاں سے ہزاروں میل دور جھنگ شہر میں اپنے آنگن میں چارپائی پر لیٹا آسمان پر تارے دیکھ رہا ہوں۔ 50 برس پہلے کی بات ہے۔ سوچ رہا ہوں کہیں ایسے ہی کوئی خوبصورت لڑکی بھی اپنے آنگن میں گزرتے چاند تاروں کو دیکھ رہی ہوگی۔

آسمان، چاند، تارے، غاریں، گپھائیں، درخت، سمندر، گلیاں، رستے، کھیت کھلیان، پہاڑوں کی چوٹیاں ایک سی ہوتی ہیں۔ انسان بھی ایک سے پیدا ہوتے ہیں۔ ان کے دکھ، خوشیاں بھی ایک سی ہوتی ہیں۔

جناب ڈاکٹر اچھیوتا سنمتا

بھائیو، بہنو۔

یہاں اس ہال میں بیٹھے ہم سب بھی ایک سے ہی ہیں۔ ہماری سوچیں بھی ایک سی ہیں ہمارے ہال بھی اسی طرح لکھنے پڑھنے والوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ تقریریں، کویتا اسی طرح پیار سے سنی جاتی ہیں۔ اور تالیاں بھی اسی طرح بجتی ہیں۔

مگر مجھے ایسا لگ رہا ہے۔ میں کوئی سپنا دیکھ رہا ہوں۔ پہاڑ، ہریالی، ساگر، پیار سے رنگے چہرے۔ آنکھوں میں آشا کے دیئے۔ پرنام، سلام اور محبت، شانتی، کوئل کی کوکو، چڑیوں کی چہچہاہٹ گیان ڈھونڈتے نروان پاتے لوگ۔ مکتی کے گیت گاتی آتمائیں، گیندے کے پھول۔

میں خوش ہوں ایک بچے کی طرح۔ ایک دنیا رنگوں بھری، حیرتیں، پیار لیے میرے گلے لگ رہی ہے۔ مورتیوں، مجسموں، پتھروں پہ کھدی لکیروں کی سرزمین، پیڑ گرم جوشی سے مل رہے ہیں۔ کیا میں بھبنیسور میں اس سے مل سکوں گا۔ جس کی کھوج میں صدیوں سے نگر نگر گھوم رہا ہوں۔ کیا میں جان سکوں گا کہ آخر کون ہوں میں۔ کیا مجھے ان سوالوں کے جواب مل سکیں گے جو میرے من میں برسوں سے تڑپ رہے ہیں۔

اسی نے آج بتایا مجھے کہ کون ہوں میں
وہ جس کو آج سے پہلے میں جانتا بھی نہ تھا
کہاں ہو کون ہو ہر سانس پوچھتی ہے مجھے
کبھی میں اپنے سوالوں میں یوں گھرا بھی نہ تھا

میں ان کی دھن میں راجپورے بھی جا چکا ہوں۔ جہاں میں 1942 میں پیدا ہوا۔ اور پانچ سال بعد ہی مجھے سب کو چھوڑ کر ایک نئے دیس جانا پڑا۔ شاید میں اپنے آپ کو وہاں ڈھونڈ سکوں۔ مال گاڑی کے کُھلے ڈبے اور ماں کی گود میں ڈوپٹے کے سائے میں۔ قتل ہونے والوں کی آہوں، قتل کرنے والوں کے نعروں کے شور میں۔ اب بھی یہ آوازیں سنائی دیتی ہیں۔ پہلے کوئی مسلا تھا کوئی ہندو، کوئی سردار، اب جہاں میں ہوں، وہاں مارنے والے بھی وہی کلمہ پڑھتے ہیں، مرنے والے بھی۔

اپنے مقتول ہیں اپنے قاتل
یہ عجب شام و سحر بھی دیکھو
اک طرف گرتے سروں کی بارش
اک طرف جھومتے سر بھی دیکھو

پھر یہ سوچ:

یہاں دریا میری بہنوں کی لگن سے کھیلے
واں سمندر مرے بچوں کی بلی مانگتے ہیں

دھنے واد، کے آئی ٹی ٹی یونیورسٹی
نوازش کرم، شکریہ مہربانی
یونیورسٹی کے فاؤنڈر سنمتا جی
بہت بہت تھینکس، مہندرا پرساد

کتنے مہینے گزر رہے ہیں، کوئی دن ایسا نہ ہوگا جب ان کا فون نہیں آیا، ای میل نہیں بھیجی۔ آنا تو پہلے تھا۔ ویزا ملتے ملتے کیلنڈر بدل گیا، پتہ نہیں ہم میں کیا گُن ہیں۔ جو کے آئی ٹی ٹی یونیورسٹی جیسا MIRACLE کرنے والے مجھے بُلا رہے ہیں۔ میں ان کے کیا کام آ سکتا ہوں

مجھے نہ جانے وہ سینے سے کیوں لگائے پھرے
میں کوئی گل بھی نہ تھا موجۂ ہوا بھی نہ تھا

میں ایک عام سا جرنلسٹ ہوں۔ اجپورے کے بہت ہی غریب گھر میں آنکھ کھولی، پھر پاکستان میں ایک چھوٹے سے شہر جھنگ میں ٹھکانہ ملا۔ ہمارے والد حکیم صوفی شیر محمد، پٹیالے کے باغیوں میں سے تھے، انگریز کے خلاف مہاراجہ پٹیالہ کے خلاف لڑتے رہے، جیلیں کاٹیں۔ پھر پاکستان میں بھی جیلیں ان کا نصیب رہیں۔ ہم نے بھی جنرل ضیاء الحق کے وقت میں جیل کاٹ کر والد کو follow کیا۔ میری چھوٹی بیٹی جیل میں آتی تھی وہ اتنی سی تھی۔ جتنا سا میں راجپورے اپنی جنم بھومی کا گھر چھوڑتے وقت تھا۔ وہ جیل کے پھاٹک پر کہتی تھی: ''ابّو۔۔ مجھے وہ کوٹھڑی دکھاؤ۔ جہاں تم ہم سب کو چھوڑ کر رہنے لگے ہو'' اب اسکی بیٹی اتنی سی ہے۔ وہ روز فون کر کے کہہ رہی ہے۔

''نانا۔آپ انڈیا سے کب واپس آئیں گے''۔

یہ سوالوں کا سلسلہ ختم نہیں ہوتا۔بیٹیاں کتنی پیاری ہوتی ہیں۔میری نظم ''بیٹیاں پھول ہیں''۔پوری دنیا میں پسند کی گئی ہے۔

پھول جب شاخ سے کٹتا ہے بکھر جاتا ہے
پتیاں سوکھتی ہیں ٹوٹ کے اڑ جاتی ہیں
بیٹیاں پھول ہیں۔
ماں باپ کی شاخوں پہ جنم لیتی ہیں
ماں کی آنکھوں کی چمک بنتی ہیں۔
باپ کے دل کا سکوں ہوتی ہیں
گھر کو جنّت سا بنا دیتی ہیں
ہر قدم پیار بچھا دیتی ہیں

جب بچھڑنے کی گھڑی آتی ہے
غم کے رنگوں میں خوشی آتی ہے

ایک گھر میں تو اترتی ہے اداسی لیکن
دوسرے گھر کے سنورنے کا یقیں ہوتا ہے
بیٹیاں پھول ہیں۔
اک شاخ سے کٹتی ہیں مگر
سوکھتی ہیں نہ کبھی ٹوٹتی ہیں
اک نئی شاخ پہ کچھ اور نئے پھول کھلا دیتی ہیں

اپنی بیٹیاں تو سب کو ہی پیاری ہوتی ہیں۔لیکن دوسروں کی بچیوں کے لئے چنتا کرنا،انہیں پالنا، پڑھانا،ایک سمجھدار عورت بنا کر اپنے گھر بھیجنا۔یہ تو بہت بڑا کام ہے

MISSION IMPOSSIBLE کا لنگا انسٹی ٹیوٹ آف سوشل سائنسز kiss۔ اچھے کس کی تمّنا میں تو عاشقوں پریمیوں نے عمریں گزار دی ہیں۔

کتنا خوبصورت نام بن رہا ہے۔کتنا نیک کام ہو رہا ہے یہاں،جنگلوں کے باسیوں کو سنوار نکھار کر بھیجا جا رہا ہے

ہمارے قومی شاعر اقبال کا کہنا ہے

ترا مقام امیری نہیں غریبی ہے
خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر

میں سمجھتا تھا کہ میں اس کی مثال ہوں، لیکن اقبال کے شہر سے ہزاروں میل دور سمتا جی اس پر عمل کر کے بہت آگے نکل گئے ہیں۔ مہندر اجی مجھے لیکر چل رہے ہیں۔ ایک کے بعد دوسرا کیمپس، ایک سے دو جا بڑھیا، اپنی دھرتی سے اتنی لگن کہ سارے کیمپس ندیوں اور دریاؤں کے نام پر، ندیاں دریا بہتے رہتے ہیں۔ علم، حکمت، شبد، یہ بھی صدیوں سے بہہ رہے ہیں۔ کبھی نہیں سوکھتے، دریا ہمارا جیون ہیں، پانی ہماری زندگی ہے۔

مجھے چناب نے پالا تو سندھ نے سینچا
مرے مزاج سے دریا دلی کبھی نہ گئی

میں نے اک غزل لکھی تھی؛

عمر گزری کہ حری دھن میں چلا تھا دریا
جا بجا گھومتا ہے آج بھی پگلا دریا

بی اے میں تھا۔ ایک ادبی میگزین میں چھپی، لاہور گورنمنٹ کالج پورے جنوبی ایشیا کی بڑی درسگاہ ہے، یہاں اقبال نے تعلیم حاصل کی، فیض احمد فیض نے، پطرس بخاری اور بڑے بڑے لکھاریوں نے، یہاں کے پڑھے ہوئے انڈیا میں بھی بہت ہیں، یہ اولڈ راوین کہلاتے ہیں۔ راوی لاہور کے ساتھ بہتا ہے، ہم پاکستانی کہتے ہیں کہ اس کا پانی انڈیا نے روک لیا یہ سوکھ گیا ہے۔
اس کالج کے پرنسپل ڈاکٹر نذیر احمد، کوتیا، اور سرتال کے بہت چاہنے والے تھے انہوں نے یہ غزل پڑھی تھی مجھے صرف اس غزل کی وجہ سے کالج میں داخلہ مل گیا۔ جس طرح یہاں tribal لڑکوں لڑکیوں کی تعلیم مفت ہے۔ اسی طرح مجھے بھی ایم اے فلسفہ مفت کرنے کا موقع مل گیا۔ اور میں یہاں کے کالج میگزین راوی کا ایڈیٹر بھی بنا دیا گیا۔

1961 - 1962 گورنمنٹ کالج جھنگ کے میگزین کارواں 1963-1964 میں گورنمنٹ کالج لاہور کے میگزین راوی۔ پھر 1965-1966 میں نوائے وقت کے میگزین قندیل، پھر 1967 میں روزنامہ جنگ کے میگزین اخبار جہاں کا ایڈیٹر، راجپورے کا غریب بچہ کس طرح آگے بڑھ رہا ہے۔

اخبار جہاں کے ایڈیٹر کی حیثیت سے میں 1972 میں شملہ مذاکرات کی رپورٹنگ کے لئے ذوالفقار علی بھٹو کے ساتھ آتا ہوں، میڈم اندرا گاندھی، سردار سورن سنگھ سے ملنا ہوتا ہے۔ اٹل بہاری واجپائی اس وقت شملے میں معاہدے کے خلاف مظاہرے کر رہے تھے۔ پھر اسی میگزین کی طرف سے بھارت کی طاقت ور وزیر اعظم اندرا گاندھی سے انٹرویو کے لئے آتا ہوں۔ پہلا پاکستانی جرنلسٹ۔ ان دنوں دونوں ملکوں کے سفارتی تعلقات نہیں ہیں سوئزرلینڈ کا سفارت خانہ نگرانی کرتا ہے۔ میڈیم اندرا گاندھی سے یہ ملاقات پارلیمنٹ ہاؤس کے چیمبر میں ہوتی ہے۔ دونوں ملکوں میں نہ ٹیلی فون کا رابطہ ہے نہ ڈاک کا آتے وقت میں سوڈیڑھ سو خط لے کر آتا ہوں۔ جنھیں یہاں پوسٹ کرتا ہوں۔ کتنے لوگوں کے درمیان تعلق دوبارہ قائم ہوتا ہے، کچھ رشتے رکے ہوئے تھے، وہ میرے آنے سے جڑتے ہیں

پاکستان اور بھارت میں تعلقات کا یہ زمانہ بہت بُرا تھا، 90 ہزار جنگی قیدی ہمارے یہاں تھے، راستے بالکل بند، رشتے ختم، اب تو بہت آگے ہیں میں روزانہ فون پر گھر بات کر رہا ہوں۔ خط بھی آتے جاتے ہیں، ای میل ہے، انٹرنیٹ ہے، بسیں چل رہی ہیں، جہاز بھرے آتے جاتے ہیں بات آگے بڑھ رہی ہے۔ میں شاید پہلا پاکستانی رائٹر ہوں جو یہاں آیا ہوں اور لوگ بھی آئیں گے۔ یہ اللہ کی کرپا ہے کہ مجھے اکثر جگہ پہلے one and only کا

honor ملتا ہے۔ شملے کے بعد میں نے آگرہ مذاکرات کی رپورٹنگ بھی کی وہاں میں ڈھونڈتا رہا۔ کوئی شملہ کا رپورٹرمل جائے نسلوں کی دوریاں ہیں ادھر پاکستان میں بےنظیر بھٹو کا پہلا انٹرویو بھی میں نے کیا۔ اس وقت وہ 17 سال کی تھیں۔ لندن میں اسٹوڈنٹ تھیں۔ ان کے پاپا ذوالفقار علی بھتو نے انھیں 70 کلفٹن کے ڈرائنگ روم میں بٹھا کر کہا۔ محمود تم اسکا انٹرویو کرو یہ 1970 کی بات ہے۔ اس وقت کیا خبر تھی یہ انٹرویو نہیں، میں ایک تاریخ لکھ رہا ہوں ۔1970 سے ان سے یہ رابطہ ان کی شہادت تک جاری رہا۔ آخری انٹرویو بھی تفصیلی میرا ہی تھا۔ جو نومبر 2007 میں لیا۔ وہ جس طرح شہید کی گیئں ۔ دنیا کی بہت بڑی ٹریجڈی ہے میں نے اسی روز نظم لکھی تھی

ایسے بہنوں کو تو رخصت نہیں کرتے بھائی
ایسے بیٹی کو تو میکے سے نہیں بھیجتے ہیں
ایسے تاریخ تو قومیں نہیں لکھتیں اپنی
ایسے تہذیب کا چہرہ نہیں جھلسا جاتا
یوں تدبر کو کہاں زہر دیا جاتا ہے
ایسے افکار پہ نیزے نہیں پھینکے جاتے
ایسے تقدیر پہ شمشیر کہاں چلتی ہے
یوں عقیدوں سے ہلاکت نہیں بانٹی جاتی
چھوڑیں بچوں کے لئے آگ لہو کا ورثہ
ایسے ماں باپ تو دنیا میں نہیں ہوتے ہیں

پاکستان کے صدر آصف علی زرداری بھی ہمارے اس انٹرویو کی اہمیت کا سب کو بتاتے ہیں۔ ابھی انڈیا آنے سے دو روز قبل 21 جون کو بےنظیر بھٹو شہید کی سالگرہ تھی۔ 5 ہزار سال پرانی تہذیب موئن جوڈرو کے قریب نوڈیرو میں سیمینار منعقد کیا گیا۔ میں نے پیپر پڑھا اسٹیج پہ آیا تو صدر مملکت احترام سے کھڑے ہوئے۔ پیپر ختم کیا تو وہ پھر کھڑے ہو گئے۔ پھر اپنی تقریر کے دوران بھی دو تین بار میرا ریفرنس دیا۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ ایک سلسلہ ہیں ذوالفقار علی بھٹو پھر بےنظیر بھٹو ان کی خواہش ہے کہ میں تیسری پیڑی بلاول بھٹو زرداری سے بھی ملوں۔ اس کے ساتھ بھی میری تصویر ہو۔ اس طرح ایک تاریخی hattrick ہو جائے گی۔

بات کہاں سے کہاں چلی گئی ہے دونوں ملکوں کے درمیان جو بھی تلخیاں کڑواہٹیں ہیں۔ جو قائداعظم اور مہاتما گاندھی کے درمیان تھیں، لیاقت علی خان اور نہرو میں تھیں، بھٹو اور اندرا گاندھی میں تھیں، مشرف اور واجپائی میں تھیں۔ من موہن سنگھ جی نے انہیں موہالی کے گراؤنڈ میں دفن کر دیا۔ یہ بات چیت پھر سے چل پڑی ہے، یہ کڑواہٹیں راہول اور بلاول کے درمیان نہیں ہونی چاہئیں۔ میرے اور آپ کے گرینڈ چلڈرن آپس میں دوست ہونے چاہئیں۔ سرحدیں اب ختم نہیں ہوسکتیں انہیں دونوں طرف کے فوجیوں اور شہریوں کا لہو مل گیا ہے۔ یہ اب پکی ہوگئی ہیں۔ پاکستان اور بھارت دونون حقیقت ہیں اکھنڈ بھارت کا خواب ہو یا لال قلعے پر پاکستانی پرچم لہرانے کا یہ سپنے پورے نہیں ہو سکتے۔

حقیقت تو کبھی خواب نہیں بن سکتی

رات کی کوکھ سے ہوتا ہے سویرا پیدا
جنگ کی راکھ سے ہی امن جنم لیتا ہے
ہو چکی رات بہت ہی لمبی
ہو چکی رات بہت ہی کالی
جنگ تو کتنے نگر پھونک چکی
کتنی ماؤں کے جگر کاٹ چکی
بہہ چکا کتنا لہو۔ گرم لہو۔ تازہ لہو
دشت و صحرا میں پہاڑوں میں گلی کوچوں میں
رنگ لاتا ہی نہیں اب تو شہیدوں کا لہو
اب یہ لگتا ہے کہ تاریخ نے کروٹ بدلی
شل ہوئے ظلم و ستم کے بازو
تھک گئے خون بہانے والے
اب تو ہتھیار بھی نادم ہیں ہلاکت پہ یہاں
یہ ہے وہ لمحہ جہاں ہوش و جنوں بھی سوچیں
آزمائش ہے قیادت کی۔ تدبّر کی۔ بصیرت کی یہاں
اب اگر جیت ہے تو صرف حقیقت کی یہاں
خواب کوشش سے حقیقت میں بدل سکتے ہیں
پر حقیقت۔ تو کبھی خواب نہیں بن سکتی
آیئے مان لیں۔ ہیں دونوں حقیقت ہم تم
اب ہمیں کوئی بھی خوابوں میں نہیں بدلے گا
سرحدیں خون سے لکھی ہوئی تقدیریں ہیں
سرحدیں دل میں ابھرتی ہوئی تصویریں ہیں
آیئے مان لیں۔ ہیں دونوں حقیقت ہم تم
اب ہمیں کوئی بھی خوابوں میں نہیں بدلے گا

یہ نظم آگرہ مذاکرات کے وقت ہونے والے ایک مشاعرے میں پڑھی تھی، پرانی دلّی میں، وی پی سنگھ صدارت کر رہے تھے، احمد فراز مرحوم بھی موجود تھے۔

اللہ نے ایسا نہیں چاہا، نہ ہی یہ تاریخ کا کوئی اصول ہے۔ ذوالفقار علی بھٹو بار بار کہتے تھے کہ یہ جنوبی ایشیا کے انسانوں کا مقدر نہیں ہے کہ آپس میں لڑتے رہیں، غربت کے جنگلوں میں پھنسے رہیں۔

قائداعظم کا کہنا تھا:- ہمیں یہ اصول سامنے رکھنا ہے کہ ہم آزاد ملک کے شہری ہیں، وقت کے ساتھ ساتھ ہندو ہندو نہیں رہیں گے مسلمان مسلمان نہیں انہوں نے یہ وضاحت کی کہ مذہبی حوالے سے نہیں بلکہ ہر شخص کی اپنی ذات کے لحاظ سے، سیاسی حوالے سے، سب ایک ملک کے برابر کے شہری ہونگے۔

قائداعظم کا ذہن بالکل صاف تھا، مگر وہ ایک سال میں ہم سے جدا ہو گئے۔ آنے والے انکے افکار سے دور ہوتے گئے، انہوں نے کہا تھا، پاکستان مذہبی ریاست نہیں ہوگی۔ رفتہ رفتہ یہ ایک ایسا معاشرہ بنا دیا گیا ہمارا اتیق ماضی، خون اور آگ سے بھرا ہے۔ لڑائیاں بہت ہو چکیں، خون بہت بہہ چکا، سر بہت کٹ چکے، اب ہماری نئی نسل خون دیکھنا پسند نہیں کرتی، لڑنا نہیں آگے بڑھنا چاہتی ہے۔ نئی دنیائیں ڈھونڈ رہی ہے۔ کیسے ہمارے ذہین نوجوان انڈیا سے پاکستان سے بنگلا دیش سے کہاں کہاں جا کر بس رہے ہیں۔ دوسرے دیسوں کی ترقی میں اپنا خون پسینہ بہا رہے ہیں نئے علوم اور نئی ٹیکنالوجی میں اپنا نام پیدا کر رہے ہیں، مل جل کر کام کرتے ہیں، اکھٹے کمپنیاں بھی بنا رہے ہیں۔ وہ وہاں دیکھتے ہیں کہ یورپ میں جہاں فرانس، انگلینڈ آپس میں برسوں لڑتے رہے، لاکھوں مارے گئے، ہزاروں مکان تباہ ہوئے۔ اب وہ جنگ کی بات بھی سننا نہیں چاہتے۔ کوئی ویزا نہ کوئی چیک پوسٹ، ایک ملک سے دوسرے ملک میں ایسے داخل ہو جاتے ہیں جیسے ایک سے دوسرے محلّے میں چلے جائیں۔

تاریخ ہمیں بھی آواز دے رہی ہے، لیکن جغرافیے کی زنجیریں جکڑ لیتی ہیں، مذہب جو محبت کا درس دیتا ہے، اسکے حوالے سے نفرتیں نسلی فساد، حکمرانوں کی لوٹ مار، انتہا پسندوں کا غلبہ۔

لمحے چیلنج دے رہے ہیں، مواقع دعوت دے رہے ہیں۔ ہمارے یہ علاقے ہزاروں سال پہلے سے تہذیب اور تمدّن کا گڑھ تھے یورپ اور امریکہ نے بولنا ہم سے سیکھا، چلنا ہم سے سیکھا۔ وہ جنگ کا راستہ چھوڑ کر انسان کی زندگی آسان سے آسان کرنے لگے ہیں۔ علاج معالجے میں سہولتیں قدرتی وسائل کو تلاش کر کے انسانی جان کی حفاظت کر رہے ہیں۔

یورپ تو ذرا فاصلے پر ہے۔ اس سے سبق نہ سیکھیں۔ ہمارے تو اپنے گھر میں یورپ سے ہزاروں سال پہلے خون بہانے سے تنگ آ کر امن اور شانتی کو ہی جیون کے لیے بہتر سمجھا گیا۔

میں دھاؤلی میں کھڑا ہوں۔

شانتی سٹوپا بھی مجھے یہی کہہ رہا ہے۔

یہ وہ جگہ ہے جہاں اشوک اعظم نے ہتھیار رکھ دیئے۔ کالنگا کی جنگ ختم کی۔ یہاں آرام کے لئے آ گیا اشوک نے اور بہت سے اچھے کام کئے لیکن سب سے بڑا تھا قوموں کے درمیان امن کا قیام۔

یہ سٹوپا امن کی علامت ہے آنے والی نسلوں کے لئے یہ ایک شہنشاہ کی امن کی آشا ظاہر کرتا ہے۔ اور آج کی ایٹمی دوڑ کے خلاف ہے۔ جو دنیا کو بالکل ختم بھی کر سکتی ہے۔

اڑیسہ کے رہنے والو۔ تم شاعر ہو کتھا کار ہو۔ ٹیچر ہو، سرکاری افسر ہو، تم خوش قسمت ہو۔ تم شانتی سٹوپا کے وارث ہو۔ یہ سفید رنگ امن کا پرچم ہے۔ ہزاروں سال پہلے اشوکا نے جو راز پا لیا تھا۔ وہ پاکستان اور بھارت کے حکمراں کیوں نہیں پا سکتے۔ جنگ مسائل کا حل نہیں۔ خود ایک مسئلہ ہے۔

دنیا میں آپس کی نفرتیں، تعصب، آگ اسی وقت ختم ہوئی جب علم کی روشنی پھیلی۔ کے آئی آئی ٹی اس کی زندہ مثال

ہے۔قبائلی Tribal معاشرے کے پندرہ ہزار بچوں بچیوں کو مفت تعلیم کی فراہمی ایک روشن اور محفوظ مستقبل کی ضمانت ہے۔جنگلوں کے باسی شہروں کے باسیوں سے نہیں لڑیں گے۔ان کے پاس علم بھی ہے، جانکاری بھی، skill بھی، یہ بندوق کے بجائے قلم اٹھائینگے، ڈھال کی جگہ کتاب۔ایک روز بھبنیسور آس پاس اور ٹرائبل علاقے یورپ جیسے بن جائیں گے۔میں نے جو کچھ kiss میں دیکھا ہے اور کئی دیسوں میں گیا ہوں اتنی گہری محبت انسانیت سے نہیں دیکھی، صرف تعلیم نہیں تہذیب بھی سکھائی جارہی ہے۔

یہ پورے ہندوستان کے لئے پاکستان کے لئے اور ساری دنیا کے لئے ایک روشنی کا مینار ہے۔لگن، Commitment۔

یہ جو نسلیں تیار ہورہی ہیں، ایسے شہری ہی دنیا کی کایا پلٹتے ہیں۔

یورپ امریکہ میں یونیورسٹیوں نے ہی معاشرے کو بدلا ہے۔اس علاقے میں بھی یونیورسٹیوں کو یہ کردار ادا کرنا ہے۔

چند اشعار اس Miracle کے فاؤنڈر کے لئے

گھپ اندھیرے میں ستارہ چمکا
رات سے لڑتے ہوئے عمر کٹی
صبح کی کھوج میں جیون بیتا
باپ کا سایا لڑکپن میں اٹھا
دکھ کو طاقت میں بدل کر رکھا
کام اور کام ہی دن رات کیا
جنگلوں کو بھی کیا ہے روشن
علم کی جوت جلی ذہنوں میں
نفرتیں ختم قبیلوں میں ہوئیں
جانکاری کی لگن تیز ہوئی
اب کتابیں ہیں ادی باسی ہیں
ہیں قلم ہاتھ میں بندوق نہیں
ہر طرف پیار کا سندیسہ ہے
یوں پہاڑوں میں محبت پھیلی
نام دنیا میں اڑیسہ کا ہُوا
روشنی ملتی ہے کالنگا میں
آگہی ملتی ہے کالنگا میں
اک فریشتہ ہیں سمنتا samanta جی تو
دل کے سلطان ہیں کہلائیں فقیر
ان کے دم سے ہے اجالا گھر گھر

جپتی ہے علم کی مالا گھر گھر
یہ نگر امن کے آباد رہیں
سب سٹوڈنٹس کے من شاد رہیں

جی تو چاہتا ہے کہ باتیں کرتا جاؤں۔اتنے صبر سے۔لگن سے سننے والے کہاں ملتے ہیں۔لیکن ہر آغاز کا انجام ہوتا ہے۔ہر شروعات کو ختم ہی ہونا ہوتا ہے۔میں یہ چاہوں گا کہ میں جو اتنی دور آیا ہوں اور آپ نے جس طرح مجھے پیار۔محبت۔عزت دی ہے۔یہ سلسلہ جاری رہے۔اور آج کی یہ تقریب بنیاد بن جائے ایک campaign کی۔ایک مہم کی۔جو دونوں ملکوں کی یونیورسٹیوں میں جاری ہو۔آپ اس کی تائید کریں گے منظوری دیں گے۔تو میں پاکستان میں بھی اس کی بات کروں گا وہاں بھی majority امن پیار محبت عزت چاہتی ہے اور یہ تعلیم وتہذیب سے ہی مل سکتی ہے۔ہمارے ہاں کی دہشت گردی۔انتہا پسندی بھی علم سے ختم ہوسکتی ہے۔دونوں ملکوں میں تعلیم جیسے جیسے زیادہ ہوگی اسی طرح شانتی بڑھے گی تہذیب،ثقافت اور تمدن وسیع ہوگا ۔امن قائم ہوگا۔انسان کو سہولتیں ملیں گی۔
اس کا نام رکھا جائے

PEACE THROUGH KNOWLEDGE(امن بذریعہ علم)

یونیورسٹیوں میں اس عنوان کے تحت کام ہو۔اسٹوڈنٹس ٹیچرز کے تبادلے۔کتابوں کے اپنے اپنے زبان میں ترجمے
یہاں کے رنگ وہاں بکھریں وہاں کی خوشبوئیں یہاں۔ادھر سے کوی وہاں جائیں امن محبت کے گیت گائیں۔
وہاں کے نوجوانوں کو پتہ چلے کہ یہاں کتنی حسین شاعری ہوتی ہے

بادل چھٹ جاتے ہیں
دن صاف ہے
ادھر گھر آؤ۔ہمارے ساتھ خوشیاں بانٹو
پرندوں کے گیت سنو
اور یہ سچ ہے کہ
ہم اپنے ماں باپ کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ چل دیں گے

ایک اور گیت

اس طرح کدم یا کھل کر کھلا ہوا ہے
اور کس طرح ملائی کی مہک پھیلتی ہے
اور ایسے حسین دقت میں
کس طرح کوئی میری محبوبہ کے دل میں اُتر گیا ہے
اس رم جھم پھوار میں میرے دوست
کون حسینہ اکیلی رہ سکتی ہے
محبت کی پیاس میں بے تاب ہوئے بغیر

یہ تو کچھ گیت ہیں جن کے انگریزی ترجمے سے میں نے اردو ترجمہ کیا ہے۔ ہزاروں سال پرانے گیتوں اور شاعری کے اس دیس میں نہ جانے کیسے کیسے شعر لکھے جاتے ہوں گے۔ جنگل، پہاڑ اور سمندر تو ان پڑھ کو بھی شاعر بنا دیتے ہیں۔ ہم چاہیں گے کہ اوڑیا کی آج کل کی شاعری کو اردو پڑھنے والوں تک پہنچائیں ہمیں اُمید ہے اس سلسلہ میں کے آئی آئی ٹی یونیورسٹی پورا تعاون کرے گی۔ آپ سب نے میری باتیں اتنے صبر، برداشت سے سنیں، بہت بہت شکریہ آپ کی شاعری سے دلچسپی دیکھ کر اپنی بات بھی میں شعروں پہ ہی ختم کروں گا۔

پھول بن کر تری ہر شاخ پہ کھلتا میں تھا
خوشبوئیں تجھ میں اترتی تھیں مہکتا میں تھا
میری سانسوں میں گھلی تھیں تری صبحیں شامیں
تیری یادوں میں گزرتا ہوا عرصہ میں تھا
شور تھا جیسے سمندر میں ہو گرتا دریا
اور جب غور سے دیکھا تو اکیلا میں تھا
عہد رفتہ تھا اِدھر اور اُدھر آئندہ
دونوں وقتوں کو ملاتا ہوا لمحہ میں تھا
آنکھ رکھتا تھا کھلی اور طبعیت موزوں
تجربے دوسرے کرتے تھے سنورتا میں تھا

محمود شام